طویل نظم
منقوش
نوید ملک

منقوش

نوید ملک

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

نام کتاب	:	منقوشش
مصنف	:	نوید ملک
اہتمام	:	ارشد ملک
زیر نگرانی	:	سیّد وسیم عباس
پراجیکٹ کوآرڈینیٹر	:	عادل حسین مغل
کمپوزنگ/سرورق	:	ساجد حیات
تعداد کتب	:	500
موسم اشاعت	:	جنوری 2020ء
مطبع	:	فیض الاسلام پرنٹرز، راولپنڈی

قیمت Rs. 180

ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیاری ہوں۔ اشاعتِ کتب کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ضرر رسانی نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جہت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ادارہ)

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

اقبال مارکیٹ اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی Ph: 051-5551519

مَنقُوش

(طویل نظم)

نوید ملک
03005135256
Email Address: naveed_poet82@yahoo.com
Face book page: www.facebook.com/naveedmalikpoetry
YouTube Channel: Poetry Naveed Malik

انتساب (1)

اپنے والد (مرحوم و مغفور) محبوب حسین، والدہ

اور

خالو صوفی ضمیر اختر نقیبی مرحوم

کے نام جنھیں تصوف کے سفر میں

زندگی دھول کرنے پر فخر رہا

انتساب (2)

سلمان علی، عرفان علی

محمد عبدالرحمان

اور بیگم کے نام

جن کی قربت میں حوصلے

ہمیشہ سرسبز وشاداب رہتے ہیں

محبتیں

کاشف محمود

عبداللہ بشیر قریشی، حسنین بشیر قریشی،

دریشہ خالد،

اقراء وحید، آفاق وحید، محمد صارم خان

محمد صائم، زنیرہ فاطمہ، وردہ فاطمہ

اور

عبدالہادی، محمد عبدالوہاب، محمد عبدالودود

کے لیے

مَنقُوش۔۔۔۔نوید ملک کا شاہکار

اردو زبان میں ادب کا سرمایہ اتنا زیادہ ہے کہ اس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص اس کے شعری سرمایہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ سرمایہ معیار اور مقدار ہر دو اعتبار سے دنیا کے کسی بھی ادبی سرمایہ کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اردو کے شعری سرمایہ میں نظموں اور بالخصوص طویل نظموں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ مگر اتنی کم بھی نہیں ہے کہ احساس کم مائیگی کا شکار ہو جائے۔ اس کے باوجود اس وقت نوید ملک صاحب کی جو طویل نظم میرے پیش نظر ہے اس کو اردو کی بہترین طویل نظموں میں شامل کرنا کسی بھی طرح غیر مناسب نہیں ہوگا۔ نظم کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک طویل گیلری سے گزر رہے ہیں جہاں عالمِ انسانیت کی ہر طرح کی تصویریں آویزاں ہیں اور یہ تصویریں اپنی جگہ ہر طرح سے مکمل ہیں۔ چاہے وہ تصویریں ظلم و جبر کی ہوں، رشوت خوری اور چور بازاری کی ہوں، مذہب کے نام پر برتی جانے والی ریاکاری کی ہو، محبت کو پامال کرنے والی جنسی عیاری کی ہو، ملٹی نیشنل کمپنیوں کا چھوٹی کمپنیوں کو نگلتے جانے کی گہری سازش کی ہو، طاقتور ملکوں کا

کمزور ملکوں کو دبانے کی ہو یا پھر روحانیت اور مادیت کو آلودہ کرنے کی گہری سازش کی ہولناکی کی ہو، مگر مزے کی بات یہ ہے کہ نظم کو پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے کہ نوید ملک غیر معمولی فنکار ہیں۔ کیوں کہ اس طویل نظم کی قرأت کے دوران کہیں پر یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ فنکار کی سانس اکھڑ رہی ہے یا اس کی تصویر کشی دھندلا رہی ہے یا یہ کہ وہ خود پر جبر کر کے قدم آگے بڑھا رہا ہے۔ پوری نظم ایک بیٹھک میں پڑھ جائیے۔ ایسا لگتا ہے کہ تخلیقیت کا ایک چشمہ ہے جو ابلتا آ رہا ہے اور قاری اس کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی نظمیں کہتے ہوئے بھی بار بار سانسیں درست کرتے ہیں تب کہیں جا کر منزلِ مقصود پر پہنچتے ہیں۔ مگر نوید ملک صاحب تخلیقی موّاجی کے بہاؤ میں ایک لمبی سانس کے ساتھ ہی نظم کے اختتام تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایسا کرنا ہر فنکار کے بس کی بات نہیں ہے۔ نوید ملک صاحب نہایت کامیابی سے نظم کو زینہ بہ زینہ بلندیوں تک لے جاتے ہیں اور پھر نہایت سلاست اور دل میں اتر جانے والے انداز میں اختتام کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس نظم میں واقعاتی تناظر کی فراوانی بھی ہے۔ حادثاتی مناظر کے انجذاب کی تاثیر بھی۔ نظمیہ بیان کی کشش بھی ہے اور ڈرامائی کیفیت کا امتزاج بھی، یہی وجہ ہے کہ قاری ایک گہرے انہاک اور استغراق کے ساتھ پوری نظم پڑھ لیتا ہے اور نظم کے اختتام پر اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ آسودہ اور زرخیز محسوس کرتا ہے۔ اختصار سے کہنا ہو تو ہم کہیں گے کہ اس نظم میں مادیت، روحانیت، کثافت اور لطافت سب کے سب آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ کسی کو کسی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ گویا نوید ملک صاحب نے اپنی اس نظم میں ریزہ ریزہ بکھری اور کچلی زندگی کو یکجا

کر کے اس کے سموچے پن سے قاری کو رو بہ رو کرایا ہے۔ وہ بھی اتنی خوب صورتی اور فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ کہ پوری نظم تخلیقی کرب کی لذّت کی علامیہ بن کر قاری کے دل پر وارد ہو جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس نظم کا اکیسویں صدی کی اہم ترین نظموں میں شمار ہوگا۔

ڈاکٹر امجد حسین

کرناٹک، بھارت

❁

جب آنکھیں میں نے پہلی بار کھولی تھیں

نہ جانے کیوں!

مری چیخوں کو ہر اک شخص اپنے قہقہوں سے ڈھانپ لیتا تھا

اندھیروں سے اجالوں کے زمانے میں

مرا پہلا قدم تھا

وہ زمانہ جو

مرے جیسے کئی لوگوں کے آنے جانے سے پہلے نہیں تھا

اور ماہ و سال کی کشتی

نہ جانے کون سے دریا کی لہریں گا نا کرتی تھی
عجب اک خوف طاری تھا
میں اپنی باہیں پھیلائے کسی بستر پہ جب ننگا پڑا تھا
سارے منظر ڈھل گئے تھے پچھلی دنیا کے
کوئی انجان تختی منتظر تھی میری آنکھوں کی
میں اپنی دھڑکنوں سے دل کی حالت لکھ رہا تھا
فارسی، انگلش۔۔ میرا مطلب!
کسی اک بھی زباں پر دسترس حاصل نہ تھی مجھ کو
مجھے معلوم کب تھا
کون سے دریا میں کشتی اور بھنور کے
سلسلے مجھ پر کھلیں گے
روشنی پرتوں تلک آنکھوں کی کرنیں پھیل جائیں گی
میں جب بھی گھنٹیوں یا پھر
اذاں کا شور سنتا تھا
تو میرے کان بجتے تھے

مرے ماتھے پہ جب تسبیح رکھ کر رات کو کوئی
مُصلی جھاڑتا تھا خوف آتا تھا
مرے سینے میں جتنی تیرگی تھی منجمد رہتی
مجھے کوئی
دلاسے دے کے میٹھے خواب دِکھلاتا
خبر کچھ بھی نہ تھی مجھ کو
ضرورت نے مرا مذہب تراشا
خواہشوں کی ندی جاری کی
کوئی ارماں مجھے جب تیرگی کی بستیوں میں لے کے جاتا تھا
دِیا جس ہاتھ میں بھی دیکھتا
معبود کی تصویر میرے آنسوؤں میں تیرنے لگتی
پٹاخے، بم، یہ بندوقیں، کلاشنکوف کیا ہیں کچھ خبر مجھ کو نہیں تھی
چرچ، مندر اور مسجد ایک جیسے ہی نظر آتے
نہ جانے کتنی گلیاں روند کر پہنچا ہوں اک حیرت کدے میں
جس کا ہر باسی

کبھی تشکیل کا اعلان کرتا ہے
کبھی تکمیل پر خوشیاں مناتا ہے
میں اپنی باہیں پھیلائے، یہاں ننگا پڑا ہوں
جو مناظر اِس جہاں کے میں نے دیکھے ہیں
مری آنکھوں سے وہ سارے نہیں ڈھلتے
یہاں کے سلسلے مجھ پر نہیں کھلتے

جو بابا سبز کپڑوں میں

دعائیں دے رہا ہے بے اثر کیوں ہیں؟

جو بچہ ماں کے سینے سے

لپٹ کر زندگی کی آخری ہچکی سے اٹکا ہے

دعائیں لے رہا ہے بے اثر کیوں ہیں؟

تو کیا اب آسماں کے سارے دروازے مُقفّل ہیں؟

مرے اندر تصادُم ہے

کوئی سایہ ہے جو کروٹ بدلتا ہے تو امکاں سرسراتے ہیں

بہت سی خواہشوں کے کھیت پر اگتی ہوئی فصلوں کو
جب بھی دیکھتا ہوں خوف آتا ہے
مجھے لگتا ہے اُن پر بھی
غصیلی بارشوں نے حملہ کرنا ہے
کوئی سیلاب آنا ہے
مرا یہ ذہن ماضی، حال، مستقبل میں الجھا ہے
کئی بہتان ہیں جن کی
کفالت کرنے والی بستیوں میں رقص جاری ہیں
جھلستی دھوپ میں کچھ انتقامی نقش چہروں پر
اُبھرتے ہیں
اور اُس کے بعد بے تاثیر نغمے زندگی زنجیر کرتے ہیں
مرا دل نوچ لے کوئی
کہ تنہائی میں اس کی دھڑکنوں سے وحشتوں کے ساز بجتے ہیں
نئی تہذیب کے پنچھی
کسی بوڑھے شجر کی آخری ٹہنی پہ بیٹھے ہیں

جو بھوکے اور پیاسے ہیں
وہ جب بنجر زمینیں دیکھتے ہی پھڑ پھڑاتے ہیں
تو لگتا ہے
کہ جیسے ''صور'' بھی اب پھونکنے کی وحی نازل ہو چکی ہے
اور اسرافیلؑ دنیا میں قدم دھرنے لگے ہیں
لوگ اپنی میلی نظروں سے
فلک پر روز لکھتے ہیں
''یہاں وہ اونٹنی آئے
جو صالحؑ کو ملی تھی
دودھ سارا اُس کا ہم اپنے قبیلے میں ہی بانٹیں گے
ہمارا حق ہمارے قد سے چھوٹا ہو نہیں سکتا''
خدا کو ایسے نوٹس بھیجنے والوں کے سب دفتر
مساجد سے بھی اونچے ہیں
مرے اندر جو اک معصوم بچہ ہے
مری جلتی ہوئی آہوں کی حدت سے پگھلتا ہے

جو گھٹتا اور بڑھتا ہے
ابھی اُس کی سماعت پر
بہت سے مُشتَعِل لہجے برستے ہیں
انوکھے موسموں کے ذائقے اُس کی طبیعت پر اترتے ہیں
مجھے جب مضطرب ہو کر
وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے کھرچتا ہے
تو میرے قہقہے ویرانیوں کو بوسے دیتے ہیں

وضاحت چاہتا ہوں
زندگی کیوں توپ خانوں میں مُقید ہے
وضاحت چاہتا ہوں
زندگی کن جنگلوں کے حبس میں اپنی
کمائی پھینک آتی ہے
وضاحت چاہتا ہوں
زندگی کس تیرگی میں سانس لیتی ہے
کہ اس نے ہر طرف سے روشنی کو چاٹ ڈالا ہے

وضاحت چاہتا ہوں

زندگی کا کون سا مذہب ہے دنیا میں

اور اِس کو کس صحیفے کے مطابق سب نے ڈھالا ہے

وضاحت چاہتا ہوں

زندگی کو کن درندوں نے خراشا ہے

یہ ہر بازار میں اب بین کرتی ہے

وضاحت چاہتا ہوں

زندگی کس دشت کے سینے میں جلتی ہے

نہ جانے کب تلک اِس کا سلگتا تن

بقا کی خواہشوں میں کرب اوڑھے گا

وضاحت چاہتا ہوں

زندگی کن پانیوں کے بیچ رُلتی ہے

وضاحت چاہتا ہوں

زندگی کو کون سے ''جوکر'' نے

کسی سرکس میں کچھ پیسوں کی خاطر

بیچ ڈالا ہے
میں صدیوں سے تھکا ہارا مسافر
زندگی سے ملنے آیا ہوں
مرے پرکھوں نے اِس کی کھوج میں دنیا کا ہر کونا تراشا ہے
بہت سے کشٹ اٹھائے ہیں۔۔۔مگر کیوں زندگی۔۔۔ایسی!
وضاحت چاہتا ہوں

ہوائیں آگ روتی ہیں

فلک برسا رہا ہے دھوپ کے کوڑے

درختوں کی نگاہیں نوچتی ہیں سب پرندوں کو

گھڑی کی سوئیاں تلوار بن کر

وقت کے سینے کو زخمی کر رہی ہیں

ہر نَفَس ژولیدگی میں مبتلا ہے

نت نئے مذہب بنائے جا رہے ہیں

تیرگی اب فلسفوں کے گھونٹ بھرتی ہے

تو سورج روشنی میں منہدم خوابوں کی تعبیریں چھپاتا ہے

ہماری گردنوں کو راستے بھی گھورتے ہیں

آدمی بوتا ہے لاشیں اور

زمیں نوحے اُگاتی ہے

ہر اک اخبار کا بزنس

گلی کوچوں تلک پھیلا ہوا ہے

سب فرشتے نیکیوں کی فائلوں کو بند کر کے

ریسٹ کرنے لگ گئے ہیں

لوگ اب آتش عناں لمحوں کی زد میں ہیں

ندامت کا ہر اک پنچھی

شکاری کی نگہ میں ہے

کئی اشکوں کو گالوں پر ٹپکنے سے ہی پہلے روندا جاتا ہے

بھرے جاتے ہیں آتش گیر نعرے سب کے کانوں میں

مُہم جو انقلابی بوریوں میں اپنا اپنا رزق بھرتے ہیں

کرپشن کرنے والا مفلسوں پر ہر خار اتھوکتا ہے

دعائیں ٹی سی ایس کرنے سے پہلے یہ تو سوچو
اِن سے کوئی معجزہ ہونا نہیں ہے
آسماں کے سارے دروازوں پہ جتنے قفل لٹکے ہیں
ہمیں کہتے ہیں تدبیریں تراشو
مُنتشر نظروں نے تم سے آگہی چھینی
مچھیرے جن کے پیٹوں میں
کئی صدیوں کی بوڑھی بھوک جب بے چین ہوتی ہے
تو وہ تالاب پر قبضہ جمانے کے لیے

پانی میں زہریلے عناصر پھینک دیتے ہیں

کوئی مچھلی نہیں یہ جانتی تالاب سے باہر

زمانہ کس طرح کی بھوک میں شام وسحر بے تاب ہو کر تلملاتا ہے

بہت سی الجھنوں پر اور بھی گرہیں لگاتا ہے

زمیں پر آئینے چمکے

کہ سب پر وقت اپنے عکس کھولے

ظاہر وباطن کا ہر پردہ نظر آئے

تمہیں چاہے

کسی مقتل کے تہہ خانے میں گمنامی کی سانسیں بخش دی جائیں

ہواؤں میں کبھی تم آہ مت بھرنا

کہ یہ آہوں سے شعلے پاٹتی ہیں

ہواؤں کے قبیلے ہیں
ہوائیں جن نے آدمؑ کی
دمکتی نسل کے قدموں کو نوچا
قہر برسایا
دھکیلا اُن کو غاروں کی طرف اور پھر
ہمکتی آہٹوں پر شور انڈیلا
ظلمتوں کے پہرے داروں کی ہمیشہ سرپرستی کی
کبھی افلاک کی جانب درختوں کو اچھالا

شورشوں سے جھلملاتی ساعتوں کا قتل کر ڈالا

کئی خیمے اکھاڑے

ہوا ایسی

جو اپنے ساتھ لائی ڈارون کے خط
کہ جن کو بندروں کی نسل پڑھتی ہے
وہ آدم خور بندر ہو کے بھی انسانیت کے نام کا پرچار کرتے ہیں
وہ بندر اُس مصوِر سے بغاوت نسلِ نو میں پھونکنے کے حیلے کرتے ہیں
کہ جس نے رحمِ مادر میں
انھیں پانی سے مٹی میں کیا تبدیل اور پھر روح کو
تابوت میں اک زندگی بخشی

اُنھیں فکر و تدبّر کی
کئی مالائیں پہنائیں
مگر
(مَن یُفسِدُ فِیہَا) کی جب آندھی امڈتی ہے
مخالف سمت سے عقلوں کے بخیے چند منٹوں میں
ادھڑ کر اڑنے لگتے ہیں
وہ ایسے لوتھڑے ہیں جن کا دنیا میں
کوئی مقصد نہیں ہوتا
بس اپنا رزق مٹی اور شجر سے چوستے ہیں
اور اپنی شرمگاہیں بیچ دینے کی
دلیلیں ڈھونڈتے ہیں
سارے بندر جنگلوں کو چھوڑ کر شہروں میں آئے ہیں
ادھورے معجزوں میں فلسفے تعمیر کر کے
کھردرے لفظوں سے سینوں پر
خراشیں ڈالنے کا فن سمجھتے ہیں

نہ اُن کے بال جھڑتے ہیں، نہ اُن کا ماس ڈھلتا ہے
کئی "تاتاری" لمحے اُن کے خدّوخال پر برسے
مگر پھر بھی
بدن صندوق سے آزاد ہونے والا ہر اک جسم
پُرکھوں جیسے سارے نقش اپنے ساتھ لاتا ہے

وہ بندر جب
سبق تہذیب کا تم کو پڑھائیں گے
عجب رستے دکھائیں گے

ہوا ایسی

کہ جس میں اب بھی کچھ عیّار کوّے سانس لیتے ہیں

''یمامہ'' کی فضائیں نوچنے والے وہ کوّے!

جن نے اپنی میلی چونچوں سے

اندھیروں کے گھنے برگد کی شاخوں پر

چمکتے جگنوؤں کو دیکھتے ہی شور برسایا

کئی کوّے!

اڑانیں بھرتے بھرتے اس صدی تک آ گئے ہیں

سب کو حیرانی سے تکتے ہیں
ہمارے عہد کی آنکھوں پہ
اپنے گھونسلے تعمیر کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں
میسر ہیں انھیں ایسی فضائیں جن میں ہر نا پاک بوسہ
اُن کا استقبال کرتا ہے
جب اُن کووّں پہ کچھ کنکر برستے ہیں
تو اُن کے حق میں بندر شور کرتے ہیں

وہی بندر

جو ہر مسند پر اپنے دستخط کرنے کے خواہاں ہیں
انھیں نفرت ہے ایسے کارخانوں سے
غلیلیں جن میں بنتی ہیں
وہ ایسی رُستگاری چاہتے ہیں جو
انھیں خرمستیوں کی ''شال'' پہنائے
وہ ایسی بستیوں میں جھانکتے کیوں ہیں؟
جہاں تہذیب کا نوچا ہوا سارا بدن قبلے سے خائف ہے

ہوا ایسی

جو قلب وذہن کو تسخیر کر کے

جسم کے خلیوں میں ایسے زخم بھرتی ہے

کہ جس کے بعد آنکھوں میں

ہوس کے ترجماں پروان چڑھتے ہیں

سفارت کار مرغولے پہنتے ہیں

زمیں پر جب

نگہ تفریق ہے کائناتی ابتلاؤں کو

تو جائز اور ناجائز

ہر اک شے ہاتھ کی تحویل میں آ کر

لکیریں منحرف ہونے نہیں دیتی

وسیلے کھینچ لیتی ہے

دلوں میں خواہشیں جتنی دھڑکتی ہیں

ہر اک سے مُنفعَت کی دھول اُڑتی ہے

جو سیمابی بدن میں پلنے والے سلسلے ہیں

اُن کو منزل مل ہی جاتی ہے

مگر کچے مکاں کا کوئی باسی اپنی مٹی سے

وفا جب باندھتا ہے اُس کی اجرت

دوسری سرحد کے پنچھی چُگنے لگتے ہیں

ہزاروں سائے پہلے مختلف سرگوشیوں کے سر اُگاتے ہیں

پھر اُس کے بعد وہ آسیب آتا ہے

کہ جس کے چیخنے سے وحشتیں تشکیل پاتی ہیں

چراغ اپنی ہی لَو سے خوف کھاتا ہے

نظامِ عدل اپنی پائمالی پر
کلرکوں اور وزیروں کی سیہ الماریوں میں حبس بھرتا ہے
سزا کے مرتکب کوّے
قصائی کی دکاں پر بیٹھ جاتے ہیں
بدن کے ساتھ کچھ بے چین روحوں کی خراشیں پھینکی جاتی ہیں
معلم ''درگزر'' کا درس دیتا ہے
اور اُس کو ایسا کرنے پر
بہت سی فیس ملتی ہے
ہمارا میڈیا بھی اُس صحیفے کی تلاوت عام کرتا ہے
کہ جس کے لکھنے والے اقتداری کیڑے ہوتے ہیں
نہ بچہ، بچہ ہوتا ہے
نہ بوڑھا، بوڑھا ہوتا ہے
نگاہوں کے ترازو مادیّت سے گوندھے جاتے ہیں
سفیرِ امن کو ایوارڈ ملتا ہے
کہ اُس نے موم بتی پر کتابیں لکھ کے ہر سورج کچل ڈالا

کسی ننھی پری کے جسم کو جب "جِن" کھرچتا ہے
تو اُس کی فلم بنتی ہے
وہ جب بازار میں ریلیز ہوتی ہے
تو جیبیں نوٹ اگلتی ہیں
وہ مزدوروں کی جیبیں ہوں، کہ رشوت خور ٹولے کی
برابر ڈولتی ہیں

ہوا ایسی

جو آندھی بن کے کھیتوں سے لپٹتی ہے

کسانوں کا پسینہ چاٹ جاتی ہے

ہمیشہ آگ لاتی ہے

ہوا!

جگنو، ستارے اور پنچھی کے لیے ایسے نصابی دائرے ترتیب دیتی ہے

کہ جس کے بعد ہر اسکول سے خوابوں، امیدوں کی

کئی قبریں نکلتی ہیں

اڑانیں ضبط ہوتی ہیں

پرندے جکڑے جاتے ہیں

ہراک قِندیل میں خطرے چھنکتے ہیں

ڈریکولا کے اِسٹیکر

پرائی کاپیوں پر پیسٹ کرنے کے

کراماتی ہنر ایجاد ہوتے ہیں

نئی صُبحوں کی آنکھیں کھودی جاتی ہیں

مگر اُن میں جو پوشیدہ خزانے ہیں

انھیں دیکھا نہیں جاتا

کئی ننھے "پکھیرو" ورکشاپوں میں

کسی استاد کی میلی نگہ کا رزق بنتے ہیں

اور اُس کا ننگا لہجہ پھانکنے سے چاکری کی سانس چلتی ہے

کسی درزی کو جب پالیسی سینے کو کہا جائے

وہ اُس میں

مفلسوں کی دھڑکنوں کو قید کرنے کے لیے جیبیں بھی رکھتا ہے

ریاست آٹھ گھنٹے کام کرنے کا
کرے جب حکم جاری۔۔
''سیٹھ'' مل کر ایسے جالے بُننے لگتے ہیں
کہ ہر چوبیس گھنٹے کا ملازم اپنے ہونٹوں پر
کسی شکوے کی اُفزائش نہیں کرتا

جب ایسے اشتہار اخبار کا چہرہ سجاتے ہیں
''ملازم آٹھ سالہ چاہیے ہم کو''
تو اُس کے بعد ہر اک فون سے آہیں امڈتی ہیں
غلامی آنے والی نسل میں کیسے کریں گے منتقل یہ سوچا جاتا ہے
کئی دانشوری کے بھوت ننھے حوصلوں کے دل کُترتے ہیں
بہت سے احتجاجی کالموں کے غول اخباروں میں اڑتے ہیں
سماجی ٹیبلوں پر
مفلسی کی سب طنابیں کاٹنے کے مختلف منشور سجتے ہیں
مگر پھر بھی
ٹماٹر بیچنے والوں کی ہر اک ''یونین'' کی جیت ہوتی ہے

بہت سے آئنہ بردار خود ہی توڑتے ہیں عکس جذبوں کے
ورق لفظوں کے چہرے مسخ کرتا ہے
بغاوت کسمساتی ہے
جھجک مفقود ہوتی ہے
غریبی کفر کے صحرا میں خیمے گاڑ لیتی ہے
نگہ اونچی عمارت پر کئی سجدے لٹاتی ہے
کسی وحشی کے کاندھے پر لٹکتی کالی چادر دیکھ کر ہر ایک رستہ
اُس کے حق میں دھول اڑاتا ہے
ہر اک منصوبہ بنتے ہی
مفادی زاویوں سے پرکھا جاتا ہے
منافع خور اپنے خواب بھی قرضوں میں دیتے ہیں
تماشا کرنے والا ڈگڈگی سے جنبشیں تقسیم کرتا ہے
نہ جانے کتنے بحرانوں کو شہروں میں نچاتا ہے
غبار آلود سینوں میں تحیّر منکشِف ہو کر نگاہوں کو
بجھا دیتا ہے ایوانوں کی جانب دوڑتے اور، کلبلاتے سرخ رستوں پر

عصا والے، کسی بھی سامری کے سانپ پر غصہ نہیں کرتے
یتیموں پر بھی سارے ٹیکس لگتے ہیں
قلم کی نوک سے "قابیل" کی عظمت ٹپکتی ہے
ہر اک جانب سے سورج دھوپ سب پر تھوکتا ہے اور
شجر کے سامنے اُس کا ہی سایہ کاٹا جاتا ہے
کسی بیوہ کی روٹی دیکھ کر چولھا بھی اپنی ساری حدت بھول جاتا ہے
غریبی خوف کی زنبیل میں بے چارگی کا زہر پیستی ہے
مقدس رات کے تارے بھی جب محروم طبقوں کے
دُکھوں پر ٹمٹماتے ہیں
دھواں پھیلایا جاتا ہے

ہوا ایسی

کہ جس پر مسلکوں کے ہچکیاں لیتے ہوئے لیبل

کئی فتنے اڑاتے ہیں

کبھی جنت، کبھی دوزخ بناتے ہیں

گلوب ایسے بنائے جاتے ہیں جن میں

تعارُض مختلف نقطوں پہ تاریکی کا ملبہ ڈال دیتا ہے

کبھی غاروں، کبھی جنگل، کبھی صحرا پہ دیمک پھینکی جاتی ہے

''سرابِ امن''، شہروں میں بچھانے کے لیے لاکھوں

ڈرامے نشر ہوتے ہیں
فسانے لکھے جاتے ہیں
ادھورے کھوکھلے کردار کے ہونٹوں پہ آرے باندھے جاتے ہیں
وہ جب چلتے ہیں تو نسلوں کی نسلیں کاٹ دیتے ہیں
فسادی رَہبری نیلام ہوتی ہے
کہانی کار ایسی صحبتیں زنجیر کرتا ہے
کہ جن کا ایک مقصد ''منشیّم ٹولے'' کو گرما کر
اندھیروں کی رَذالت میں
فقط ہیجان بھرنا ہے
زبانیں عشق رَٹتی ہیں
مگر اَعمال پیسے، ڈھول، لنگر، دیگ میں تقسیم ہوتے ہیں
قیامت اپنی آنکھوں میں
مساجد دفن کرتی ہے
ہر اک منبر سے جاری ہونے والے ماتمی خط کو

کسی پڑتالی "لیٹر بکس" میں ڈالا نہیں جاتا

جنونی چاند اپنی چاندنی کا سارا سرمایہ

اسی دریا کی لہروں پر لگاتا ہے

کہ جس کا قطرہ قطرہ اُس کے حق میں معترِض ہو کر

کنارے چھوڑ دیتا ہے

بھنور ترتیب دیتا ہے

نمازی کو کسی بھی شخص کا کھویا ہوا "سیل فون" مل جائے

وضو کرنے سے پہلے اُس کی "سِم" کو توڑ دیتا ہے

تھکے ہارے ہوئے سجدے

چٹائی پر مسلط کر کے دل اور روح کو تسکین ہوتی ہے

مزاروں پر عقیدت مند پھولوں کی مہک درویش اڑاتے ہیں

کتابوں کی بہت سی مُنتخب سطروں کو کر کے چاک اُن میں بھی

عقیدے ڈھونڈے جاتے ہیں

مخالف ہونٹ پر لاکھوں دلیلیں پھونکی جاتی ہیں

عجب اظہار یے بےتابیوں کی چادروں میں

ہر نئے فتنے کی آمد کو ترستے ہیں

''لچکتے بیگ'' ہر محراب کی تکفین کرتے ہیں

کئی ٹکسال پرناکارہ سکّے مغفرت کی چاہ میں ہر نقش اپنا پھینک آتے ہیں

اب ایسا ہے!

کہ چرواہوں نے اپنی بکریاں سانپوں کو سونپی ہیں

دکھاتے ہیں سپنولے دودھ پی کر طنطنہ ہر میمنا کو

اور چرواہوں کی آنکھیں بند رہتی ہیں

مگر ہم جنتی بازار میں اپنی

نگاہیں بیچ آئے ہیں

تخیل معجزے تصویر کرتا ہے

کوئی ہمسایہ بھوکے پیٹ دوزخ بھی چلا جائے

کوئی جنت کا باسی اُس کے بچوں کو

سہارا تک نہیں دیتا

کسی بھی دوزخی کی ماں کی آہیں جب

گلی میں راکھ ہوتی ہیں

کوئی جنت کا باسی اپنی پلکوں میں

کوئی جنبش نہیں بھرتا

ہوا ایسی

کہ جو جمہوریت کا شور اٹھاتی ہے

معیشت کے بدن پر کھوکھلے فتوے لگاتی ہے

بہت سے تجزیے دل پر بچھاتی ہے

مگر کونے سے آتی ہے

شجر اُس گھونسلے کو اپنی باہوں سے

الگ ہونے نہیں دیتا

کہ جس کے سارے انڈوں میں

اسی کے ووٹ ہوتے ہیں

گلستاں تتلیوں کو خوف نامے جاری کرتا ہے

اندھیرا جگنوؤں کو مٹھیوں میں گھیر لیتا ہے

ہر انساں انفرادی طور پر آزاد ہوتا ہے

مگر اُس کے قدم کی چاپ پر بھی پہرے لگتے ہیں

عزازیلوں کے لشکر استراحت بھول جاتے ہیں

سماجی کارکن کے سارے ایجنڈے

ستاروں سے اترتے ہیں

مگر غاروں میں کھلتے ہیں

کئی ''امدادی پیکج'' ذہن و دل پر ٹانکے جاتے ہیں

''یہ نالی پکی کردیں گے، یہاں نلکا لگائیں گے

کفن بھی مفت میں تقسیم ہونگے

تم! ہماری بات مانو گے

تو ہم اپنی زمیں کا تھوڑا حصہ وقف کردیں گے

وہ قبرستاں بنا کر جسم کا ملبہ

اور اپنی خواہشوں کی ریزگاری دفن کردینا''

زباں بندی کے پرزے خانقاہوں میں
بنا کر بیچے جاتے ہیں
چنیدہ آیتوں کے پوسٹر ناپاک دیواروں سے
سرکش روشنی کی چال تکتے ہیں
حریفوں پر حدیثیں پھونکی جاتی ہیں
بشارت کے سر کتے ہی
حلیف اپنی بغل پر قہقہے برسانے لگتا ہے
تعلق چھنچھناتے ہیں
جو بھائی اپنی بہنوں کے
شکستہ گھر کی دیواروں پہ نالاں تک نہیں ہوتے
وہ ان پر حق جتا کر نفسیاتی جبر کرتے ہیں
ادھوری ڈائری پر جستنی اکتاہٹ جمی ہو
آنکھ میں تارے جگاتی ہے
پرانی قربتوں سے لپٹی سرشاری کے قصے بانٹے جاتے ہیں
سخاوت دوست کی مجبوریوں پر رینگتی ہے

چلو غارِ حرا کو لوٹ جائیں!
وہی غارِ حرا جس میں
کئی نوری زمانے چند لمحوں میں سمٹ کر
صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں سے لپٹے تھے
اُسی غارِ حرا سے سرسراہٹ گنبدِ افلاک تک پہنچی
اذانیں گونج اٹھیں اور
نگاہوں نے بصارت کے بہت سے ذائقے چکھے
پہاڑوں اور صحراؤں کے ماتھے جھلملائے تو

کئی رستوں کی ویرانی پہ تازہ سلسلوں نے پرورش پائی
اُسی غارِ حرا سے زندگانی نشر ہو کر
ہر زمیں زادے کی آنکھیں چومتی تھی
خواب آلودہ زمانہ غم کدے سے کہکشاں پہنچا
سخاوت کے نمو پرور
بقاء تقسیم کرتے تھے
اُسی غارِ حرا میں ہر ستارے نے
سفر ترتیب دے کر ذلتوں کی تیرگی کو جھاڑ ڈالا اور
''وژن'' گوشہ نشینوں کا بھی چمکایا
اجالوں کی بشارت لوحِ دل پر ثبت ہوتے ہی
بشر کو اُس کا منصب یاد آیا انقلاب آیا
درخشاں آدمیّت پر
فلک کو رشک آیا
مضمحِل خورشید سے رخشندگی اُبھری
گہر سب نے پروئے

بے اماں راتوں سے مشفق قمقموں نے دوستی کرلی
چلو غارِ حرا کو لوٹ جائیں!
وہی غارِ حرا جس نے
بچایا نسلِ آدم کو ہواؤں سے
تھرکتی انتہاؤں سے۔۔۔

حرا کے طاق پہ تاروں نے سجدے بوئے تھے
ہر اک چراغ کی تنویر سے بہت پہلے
نوید ملک

شعری اثاثے

اک سفر اندھیرے میں
(غزلیں-2011)

کامنی
(نظمیں-2013)

خیر کہاں ہے؟
نوید ملک کی آزاد نظم یہی سوال کرتی ہے۔ شاعر لکھتا ہے اور قاری اُسے اپنی اپنی توفیق کے مطابق سمجھ پاتے ہیں۔ شاعر حیرتوں کے شہر میں اتارے گئے معصوم سے بات آغاز کر رہا ہے۔ یہ بچہ ہر کہیں تصادم کا سایہ دیکھتا ہے جو کروٹ بدلتا جا رہا ہے۔ سو وہ کبھی مناظر کی وضاحت چاہتا ہے، کبھی باتوں کی۔ فساد کی فضا ہر کہیں ہونے کے باوجود وہ حیران ہے کہ نئی نسل کو معلم درگزر کا درس دے رہا ہے۔ تصادم کو ٹالا جاتا ہے اور سفیرِ امن کو امن ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ ماحول غریب کے استحصال کا ہے۔ معاشرہ کمزور کے بچے اور بچی دونوں کے استحصال پر قائم ہے۔
اس ماحول میں بے زری کفر کے صحرا میں خیمہ زن ہو جانے کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتی اور ہوا ایسی ہے کہ چاروں اَور برابری، مساوات اور جمہوریت کے ڈھول پیٹے جا رہے ہیں۔ آخری بند میں شاعر غارِ حرا کو پلٹ جانے کی بات کرتا دکھائی دیتا ہے۔

چلو غارِ حرا کو لوٹ جائیں
وہی غارِ حرا جس نے
بچایا نسلِ آدم کو ہواؤں سے
تھرکتی انتہاؤں سے

تیرہ کینٹوز پر مشتمل یہ طویل نظم نئی تہذیب کے پھیلائے ہوئے شر سے (جو اب عالمی ہو چلی ہے) محفوظ ہونے اور نئے فتنوں سے بچنے کے لیے پھر اپنی روایات کی جانب پلٹنے، اپنے صحیفے کو جھاڑ پونچھ کر دیکھنے ہی میں سوالوں کے جواب پانے کی توقع کرتا ہے کہ کسی نے کسی بدعملی بابت کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔ فنی حوالے سے شاعر نے میٹر کو گرفت میں رکھا اور لسانی سطح پر مصدر سازی کی سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ایک حساس دل اور سوچتا ہوا دماغ یہیں تک آتا ہے۔ کیونکہ اکیسویں صدی تو بیسویں صدی سے بھی آگے گزر چکی ہے۔ یہ عالمگیر فتنے کا جال پھیلاتی صدی انسان کو اپنی تہذیب سے مایوس کر دینے والی ہے۔

پروفیسر احسان اکبر

نظم کو پڑھنے کے بعد اس بات کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے کہ نوید ملک غیر معمولی فنکار ہیں۔ کیوں کہ اس طویل نظم کی قرأت کے دوران کہیں پر یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ فنکار کی سانس اکھڑ رہی ہے یا اس کی تصویر کشی دھندلا رہی ہے یا یہ کہ وہ خود پر جبر کر کے قدم آگے بڑھا رہا ہے۔ پوری نظم ایک بیٹھک میں پڑھ جائیے۔ ایسا لگتا ہے کہ تخلیقیت کا ایک چشمہ ہے جو ابلتا آ رہا ہے اور قاری اس کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی نظمیں کہتے ہوئے بھی بار بار سانسیں درست کرتے ہیں تب کہیں جا کر منزل مقصود پر پہنچتے ہیں۔ مگر نوید ملک صاحب تخلیقی مزاج کے بہاؤ میں ایک لمبی سانس کے ساتھ ہی نظم کے اختتام تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایسا کرنا ہر فنکار کے بس کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر امجد حسین، کرناٹک، بھارت